# دھرتی

SDPI
Sustainable Development Policy Institute

دھرتی کا مقصد ترقیاتی برادری، نجی شعبہ، سرکاری اداروں اور متعلقہ شہریوں کو اپنی تحقیقی کاوشوں اور پائیدار ترقی کے حوالے سے اپنی جدوجہد سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ماحول اور ترقی کے حوالے سے اہم ملکی و بین الاقوامی پیشرفت سے بھی آگاہ کرتا ہے۔

دھرتی میں ظاہر کئے جانے والے خیالات، لکھنے والوں کے اپنے ہیں اور پالیسی انسٹیٹیوٹ برائے پائیدار ترقی (ایس ڈی پی آئی) کا بحیثیت ادارہ ان سے اتفاق ضروری نہیں۔

نگران : احمد سلیم

مدیر : ڈاکٹر حمیرا اشفاق

پالیسی انسٹیٹیوٹ برائے پائیدار ترقی (ایس ڈی پی آئی) کا خبرنامہ دھرتی ہر تین ماہ بعد شائع ہوتا ہے۔


## فہرست


- پاکستان اور بھارت۔۔ مذاکرات کو ایک اور موقع دیں 01
- قومی سلامتی پالیسی: ہم کہاں کھڑے ہیں 04
- پٹرول بحران سے حاصل ہونے والا سبق 09
- پاکستان میں منصفانہ مالیاتی پالیسی کی طرف ایک قدم 12



جولائی ۔ستمبر 2015ء

جلد 16 ، شمارہ 3

اشاعت : علی عامر

خطاطی و آرائش: شاہد رسول

تزئین وطبع : ورڈ میٹ



38 ایمبیسی روڈ، جی۔6/3،

پوسٹ بکس نمبر 2342، اسلام آباد، پاکستان

فون: 051-2278134/2270674

فیکس: 051-2278135

ای میل: main@sdpi.org

ویب سائٹ : http://www.sdpi.org/


# پاکستان اور بھارت۔۔ مذاکرات کو ایک اور موقع دیں

ڈاکٹر عابد قیوم سلہری

پاکستان اور بھارت کے قومی سلامتی سے متعلق مشیروں کے درمیان بات چیت منسوخ ہوگئی اور اس کی بڑی وجہ دونوں ممالک کی جانب سے اوفا بیان کی مختلف تشریح کرنا ہے۔ نئی دہلی میں قومی سلامتی کے مشیروں کے درمیان مذاکرات کے حوالہ سے اگرچہ زیادہ توقعات تو نہیں تھیں تاہم ملاقات کی منسوخی سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ایٹمی ہمسایوں میں ابھی تک اپنے تنازعات حل کرنے کے لیے سنجیدگی نہیں آئی۔

دونوں ممالک میں بات چیت کی منسوخی کی ایک بڑی وجہ مذاکرات کے ایجنڈے پر اتفاق کا نہ ہونا ہے اور یہ اوفا بیان پر مختلف تشریح اور اس نکتہ پر کہ نئی دہلی میں پاکستانی قومی سلامتی کے مشیر کو کس سے ملاقات کرنا چاہیے اور کس سے نہیں کے باعث ہوا۔

دونوں ممالک کے درمیان کشمیر پر تین جنگیں ہو چکی ہیں اور یہ دونوں ممالک کے درمیان ایک تسلیم شدہ مسئلہ بھی ہے۔ بھارتی حکومت کا موقف ہے کہ سید علی گیلانی کی قیادت میں کشمیری گروپ کشمیریوں کا نمائندہ ہے نہ پاکستان اور بھارت میں مسئلہ کشمیر پر کوئی فریق۔۔ جبکہ اس کے برعکس پاکستانی حکومت کا موقف ہے کہ یہ گروپ ہی کشمیریوں کا حقیقی نمائندہ اور اس تنازع کا اصل فریق ہے۔۔ دونوں ممالک اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہیں تاہم آگے بڑھنے کے لیے اگر دونوں ممالک ون ون صورتحال کی طرف نہیں بڑھ سکتے تو ناکامی کی طرف بھی نہیں جانا چاہیے۔

پہلے ہم سرتاج عزیز اور سید علی گیلانی کی مجوزہ ملاقات کے حوالہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ ہم رابطوں کی ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں انٹرنیٹ کے ذریعہ رابطہ کرنے کے، ویڈیو لنک، بلیک بیری میسجنگ، واٹس ایپ، سکائپ، فیس بک کال، گوگل ہینگ آؤٹ سمیت بے تحاشہ مواقع موجود ہیں اس لیے روبرو بات چیت کرنا ہی رابطے کا واحد ذریعہ نہیں۔

## ایڈووکیسی

اگر بھارتی حکومت نے سید علی گیلانی اور ان کے حامیوں کے لیے انٹرنیٹ کے ان رابطوں تک رسائی بند نہیں کی ہوئی تو پھر فکری طور پر نئی دہلی میں پاکستانی ہائی کمشنر کی طرف سے گیلانی کو دعوت دینے پر اعتراض سے بھارت کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔

فکری اعتبار سے پاکستان کے حوالہ سے بھی اگر ایسا ہی دیکھا جائے تو جب پاکستانی قیادت نے بھارت روانہ ہونے سے پہلے سید علی گیلانی سے نیٹ کے ذریعہ رابطہ کیا (اور اس ملاقات کو میڈیا میں عام کیا تا کہ یہ بتایا جا سکے کہ پاکستان ان کی جماعت کو کشمیر تنازعے کا حقیقی فریق تسلیم کرتا رہے گا) اور گیلانی کو ہائی کمشنر کی دعوت میں شرکت کرنے کا کہا تو پھر درست نہیں۔

اس تہنیتی ملاقات کو عزت اور انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے اہم بات یہ ہے کہ دونوں ممالک اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے، اس تناظر میں کہ کوئی فریق نہیں جیتا، مذاکرات شروع کرنا چاہئیں۔

**بھارتی حکومت اگر یہ سمجھتی ہے کہ سرتاج عزیز اور سید علی گیلانی کی ملاقات سے بھارتی اپوزیشن اور میڈیا کو تنقید کا موقع ملے گا اور پاکستانی حکومت یہ خیال کرتی ہے کہ ملاقات نہ ہونے سے وہ ہونے والی تنقید برداشت نہیں کر سکتی تو پھر بہتر تھا کہ دونوں ممالک مذاکرات کے لیے اسلام آباد کے مقام کو منتخب کر لیتے۔**

اجیت دیول کے دورہ پاکستان سے اس طرح کی محاذ آرائی سے بچا جا سکتا تھا اور کسی بھی فریق کو سیاسی نقصان نہ ہوتا۔ اب ذرا دونوں ممالک کے درمیان قومی سلامتی مشیروں کے مذاکرات کے ایجنڈے کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ابہام اوفا ملاقات کے بعد جاری ہونے والے بیان سے پیدا ہوا۔۔۔اوفا بیان کے دو حصے ہیں۔۔ پہلے حصے میں دونوں (وزرائے اعظم) نے اتفاق کیا کہ پاکستان اور بھارت کو امن اور ترقی کے فروغ کو یقینی بنانے کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے اور اس مقصد کے لیے وہ تمام حل طلب امور پر بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ دونوں لیڈروں نے ہر قسم کی دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے جنوبی ایشیا کو اس لعنت سے پاک کرنے کے لیے بھی مشترکہ اقدامات کرنے پر اتفاق کیا۔

ملاقات کی منسوخی سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ایٹمی ہمسایوں میں ابھی تک اپنے تنازعات حل کرنے کے لیے سنجیدگی نہیں آئی۔

## ایڈووکیسی

دونوں ممالک میں کشمیر ایک حل طلب مسئلہ ہے۔ پاکستانی موقف کے مطابق وہ بھارت کے ساتھ تمام حل طلب مسائل پر بات کرنے کو تیار ہے جن میں دیگر تنازعات کے ساتھ ساتھ کشمیر بھی شامل ہے اس لیے اوفا ملاقات کے بعد جاری بیان کے مطابق دوطرفہ مذاکرات میں کشمیر بھی ایجنڈے کا حصہ ہے۔

بھارتی خارجہ امور کی وزیر ششما سوراج پہلے حصے کو تمہید قرار دیتے ہوئے اپنا موقف بیان کرتی ہیں اور جب وہ کہتی ہیں کہ قومی سلامتی کے مشیران کے مذاکرات کا دائرہ کار صرف دہشت گردی سے متعلق ہے تو وہ اوفا بیان کے دوسرے حصے کا حوالہ دے رہی ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ دونوں ممالک نے درج ذیل اقدامات کرنے پر اتفاق کیا ہے۔

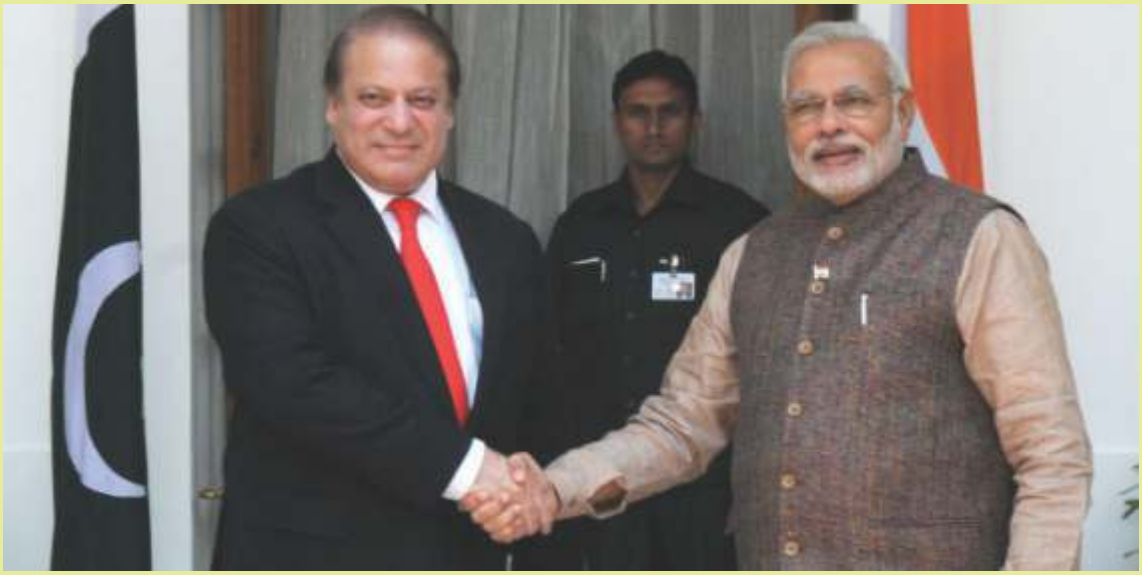

1۔نئی دہلی میں دونوں ممالک کے مشیر دہشت گردی سے متعلق امور پر غور کے لیے ملاقات کریں اور اس حصہ کے چار نکات اور بھی ہیں جن میں ڈی جی رینجرز اور بی ایس ایف کے ڈی جی کا اجلاس، ڈی جی ملٹری آپریشنز کی ملاقات، ماہی گیروں کی رہائی، مذہبی سیاحت کو فروغ دینا اور ممبئی مقدمے میں پیش رفت تیز کرنا شامل ہے۔

نظری طور پر دیکھا جائے تو یہ دونوں تشریحات اپنی جگہ درست ہیں۔مگر میں پاکستان اور بھارت دونوں کی طرف سے انکار کے ردعمل پر حیران ہوں۔ پاکستان نے کشمیر کے موقف کی اخلاقی اور سفارتی حمایت جاری رکھنے کا عزم کیا ہوا ہے مگر اوفا میں حل طلب تنازعات کا ذکر کرتے ہوئے کشمیر کو اس میں شامل نہیں کیا گیا جبکہ دوسری طرف بھارت چاہتا ہے کہ مشیروں کے مذاکرات ہر قسم کی دہشت گردی کے حوالہ سے ہونے چاہئیں۔اس کا دعوی ہے کہ کشمیر کے عسکری علیحدگی پسند گروپس کو پاکستان کے غیر ریاستی عناصر کی حمایت حاصل ہے اور پھر اس کا یہ کہنا کہ کشمیر مذاکرات کے دائرہ کار سے باہر ہے حیران کن بات ہے۔اس صورتحال کے حوالہ سے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بھارت نے واضح کر دیا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ دہشت گردی سے نہیں جڑا۔۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے اور میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کے بغیر بات چیت ایسے ہی ہے جیسے جنگ میں دو دشمن بحری جہازوں کے اسلحہ کے غیر قانونی استعمال نہ ہونے پر اتفاق کریں۔۔دونوں کو بیٹھ کر اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ جنگ کی وجہ کیا ہے۔۔

دونوں ایٹمی ہمسایوں کے درمیان جنگ کی ضرورت ہے نہ ہی اس کا خرچہ برداشت کیا جاسکتا ہے، دونوں ممالک کی قیادت کو مذاکرات کو ایک موقع دینا چاہیے۔اب یہ وقت ہے کہ ایک دوسرے کا میڈیا ٹرائل اور نمبر بنانے اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کے بجائے پرانے جھگڑوں کی وجوہات کو حل کرنے پر توجہ دیں۔

دونوں ممالک کے درمیان کشمیر پر تین جنگیں ہو چکی ہیں اور یہ دونوں ممالک کے درمیان ایک تسلیم شدہ مسئلہ بھی ہے۔

پالیسی ری ویو

# قومی سلامتی پالیسی: ہم کہاں کھڑے ہیں

شکیل احمد رامے

## تعارف:

دہشتگردی، فرقہ پرستی اور تشدد کی دوسری صورتوں سے سماجی و معاشی ترقی کا عمل رک گیا اور شہریوں کی زندگیوں کو خطرات لاحق ہوئے۔ اس صورتحال میں پوری دنیا میں پاکستان کے تشخص کو دھچکا لگا۔ ماضی میں قومی سلامتی کی مربوط پالیسی کی عدم موجودگی، قومی سلامتی فریم ورک پر پیش رفت نہ ہونا اور قومی سلامتی کے لیے اقدامات میں تسلسل نہ ہونے سے سلامتی کے مسائل پیدا ہوئے۔ ان چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے قومی داخلی سلامتی پالیسی (NISP) کا بننا، قومی انسدادِ دہشتگردی اتھارٹی (NACTA) کا فعال ہونا اور تحفظ ایکٹ 2014 (PPA) کے نفاذ جیسے کچھ اقدامات کیے گئے۔ پالیسی میں قومی داخلی سلامتی پالیسی کی روشنی میں نیکٹا کے ڈھانچے اور کام کرنے کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کا مقصد تمام فریقوں کو قومی سلامتی کے معاملہ پر ایک نکتہ پر لانا ہے۔

## پس منظر:

نائن الیون کے واقعہ کے بعد دنیا نے محسوس کیا کہ مستقبل میں تشدد اور دہشتگردی کا مقابلہ کرنے کیلئے سلامتی کے مروجہ روائتی طریقہ کار نا کافی اور نا قابل اعتبار ہیں۔ دہشتگردی کے خلاف جاری جنگ، دہشتگردی اور تشدد کے واقعات کے خلاف حکمت عملی کے نتائج مروجہ سیکیورٹی اقدامات پر ایک بڑا سوالیہ نشان تھے۔ دہشگردی، تخریب کاری اور تشدد کی نئی اقسام مثلاً سائبر کرائمز وغیرہ نے دنیا کو ان سے نمٹنے کے لیے نئے اقدامات کرنے کا احساس دلایا۔

دہشتگردی، فرقہ پرستی اور تشدد کی دوسری صورتوں سے سماجی و معاشی ترقی کا عمل رک گیا اور شہریوں کی زندگیوں کو خطرات لاحق ہوئے۔

نائن الیون کے فوراً بعد امریکی حکومت نے اپنے انٹیلی جنس نظام کا از سر نو جائزہ لیا اور کچھ ہفتوں کے اندر 22 وفاقی ایجنسیوں اور اداروں کو یکجا کر کے ملکی سلامتی کا محکمہ (DHS) قائم کیا اس شعبہ کا مقصد امریکا کو ہر طرح کی دہشتگردی کے خطرات سے بچانا تھا۔ 2011ء میں امریکا نے ایک بار پھر اپنی سلامتی کے نظام میں نظر ثانی کی اور سیکیورٹی اقدامات کو موثر بناتے ہوئے قومی دہشتگردی نظام 2011ء قائم کیا۔

امریکا میں سلامتی کے نئے نظام کے بعد کئی ممالک کو بھی ایہ احساس ہوا کہ سلامتی کے لیے نئے خطرات سے نبرد آزما ہونے کی غرض سے موثر اقدامات کیے جائیں۔ امریکا کی پیروی کرتے ہوئے برطانیہ نے بھی دہشت گردی کے تجزیہ کا مشترکہ مرکز (JTAC) اور سلامتی اور انسدادِ دہشتگردی کا دفتر (OSCT) تشکیل دیا۔ فاروق اور زیدی (2014) کی جانب سے قومی سلامتی پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں امریکا اور برطانیہ نے اپنی حکمت عملی 4 ڈیز (شکست دینا، حملہ پسپا کرنا، دشمن کا خاتمہ اور ملک کا دفاع کرنا) اور 4 پیز (بچنا، پیش قدمی کرنا، تحفظ دینا اور تیاری رکھنا) رکھی۔ اسی طرح آسٹریلیا نے بھی کونسل آف آسٹریلین گورنمنٹ (COAG) اور قومی انسدادِ دہشت گردی کمیٹی (NCTC) بنائی۔ تاہم پاکستان میں مشرف دور 1997ء کے دہشت گردی مخالف قانون (ATA) میں کچھ ترامیم کی گئیں حالانکہ پاکستان دہشتگردی کے خلاف جنگ کا فرنٹ لائن ملک تھا اور اس کے اندرونی اور بیرونی حالات اس بات کا تقاضا کرتے تھے کہ یہاں ایک جامع، واضح، کارآمد پالیسی اور عملدرآمد کی حکمت عملی بنائی جائے۔

## پاکستان میں انسداد دہشت گردی کا واقعاتی تجزیہ

تشدد، دہشتگردی اور فرقہ واریت کی لعنت پاکستانی عوام کیلئے نئی چیز نہیں ہے۔ روس کے 1979 میں افغانستان میں داخلے کے بعد پاکستان میں یہ خرافات شروع ہوئیں اور ابھی تک جاری ہیں۔اس کے نتیجے میں پاکستان میں بڑی تعداد میں حکومت کے خلاف غیر ریاستی گروہ وجود میں آئے،اس کے علاوہ مختلف سیاسی و مذہبی جماعتوں کی حمایت سے فرقہ وارانہ گروہ بھی پروش پانے لگے،بعد میں ان گروہوں کو روس کے خلاف مسلح جنگ میں استعمال کیا گیا۔دنیا نے ان گروہوں کی حمایت کی اور انہیں جہادی قرار دینے کے ساتھ ساتھ اسٹریٹیجک شراکت کار اور روس کے خلاف اتحادی کہا گیا۔افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلاء کے بعد جنگ زدہ ملک میں مختلف نسلی گروہوں کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔بعد میں وہاں ایک مضبوط حکومت کی شکل میں طالبان کا وجود سامنے آیا۔جس کی وجہ سے پورا منظر نامہ تبدیل ہوگیا۔نائن الیون تک یہی حالات رہے لیکن اس واقعہ کے بعد امریکا نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ افغانستان پر حملہ کردیا۔پاکستان بھی فرنٹ لائن اتحادی بنا۔طالبان پورے خطّے میں پھیل گئے اور اپنی صفوں میں نوجوانوں کو شامل کرنا شروع کردیا جس سے وہ مزید مضبوط ہوگئے۔پاکستان بھی اس نئی صورتحال کا شکار ہوا جو دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔

نائن الیون کے واقعہ نے پاکستان کیلئے بہت مشکلات پیدا کیں۔ایک طرف تو بین الاقوامی برادری نے پاکستان پر دہشتگردی کی مدد کرنے کا الزام لگایا تو دوسری طرف ملک کو اس جنگ میں بہت زیادہ جانی اور معاشی ترقی میں نقصان اٹھانا پڑا۔پاکستان کو 78 ارب امریکی ڈالر کی معیشت کا نقصان ہوا اور پچاس ہزار سے زائد افراد جن میں عام شہری،فوجی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے افراد بھی شامل تھے جاں بحق ہوئے۔

نائن الیون کے واقعہ کے بعد دنیا نے محسوس کیا کہ مستقبل میں تشدد اور دہشتگردی کا مقابلہ کرنے کیلئے سلامتی کے مروجہ روائتی طریقہ کار نا کافی اور نا قابل اعتبار ہیں۔

موجودہ صورتحال اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر موجود خطرات کا تقاضا ہے کہ دنیا میں پاکستان قوموں کی برداری میں اپنا تشخص بہتر اور مستقبل کے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے کوئی پالیسی بنائے۔اس ضمن میں حکومت پاکستان نے پالیسی وضع کرنے اور ادارہ جاتی سطح پر طریقہ کار بنانے پر کام شروع کردیا۔

پاکستان نے دہشتگردی کے خلاف قوانین (1975) کا آغاز کیا۔یہ قانون ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے نافذ کیا۔تاہم اس قانون کا نفاذ سیاسی مخالفین کو کنٹرول کرنے کے لیے کیا گیا۔قانون کچھ ترامیم کے ساتھ اس وقت تک نافذ رہا جب تک 1997 میں نواز حکومت نے دہشت گردی مخالف قانون (ATA) متعارف کرایا جس کا مقصد فرقہ وارانہ تشدد کا خاتمہ،امن وامان کی صورتحال کو بہتر بنانا اور فوری انصاف کی فراہمی تھا۔یہ قانون کئی اچھی ترامیم کے ساتھ نواز،مشرف اور زرداری حکومتوں میں نافذ رہا۔

دہشت گردی مخالف قانون 1997 میں ترامیم سے یہ قانون دہشتگردی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک جامع دستاویز بن گیا۔اس ایکٹ سے پہلے پولیس میں سول تحقیقاتی محکمہ بنایا گیا جو سی آئی ڈی کے 1937 کے قانون کے تحت کام کرتا تھا۔2010 میں اس کا نام محکمہ انسدادِ دہشتگردی رکھ دیا گیا۔ اس کا کام دہشت گردی سے نبرد آزما ہونا تھا۔

اس وقت 33 سول اور ملٹری انٹیلی جنس ادارے ملک کے اندر کام کررہے ہیں (NISP 2)۔ان تمام اداروں کا اپنا مخصوص ضابطہ، مشن اور کام کرنے کے قواعد وضوابط ہیں۔تاہم ان اداروں میں باہمی روابط وتعاون کا فقدان ہے اور یہ ادارے معلومات کا تبادلہ کرنے کے بجائے تنہا ہی کارروائی کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ وہ وقت تھا جب گیلانی حکومت نے 2008ء میں انسداد دہشت گردی پالیسی پیش کرتے ہوئے ایک قومی متفقہ پالیسی اور باضابطہ طریقہ کار بنانے پر کام شروع کیا اور نیکٹا (NACTA) بنانے کی تجویز دی۔بدقسمتی سے یہ پالیسی نہ بن سکی اور نیکٹا کا قیام سرکاری فائلوں تک ہی

## پالیسی ری ویو

محدود رہا۔موجودہ حکومت نے سابق حکومت کی پیروی کرتے ہوئے 2013ء میں تحفظِ پاکستان آرڈیننس 2013 (POPO) متعارف کرایا۔تحفظِ پاکستان آرڈیننس کا مقصد فوجی وغیر فوجی اداروں کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا تاکہ دہشتگردی کا موثر طور پر توڑ کیا جاسکے، پی او پی او میں واضح طور پر دہشت گردی کے خلاف لڑنا اور قومی سلامتی کو درپیش خطرات سے نمٹنا اور امن وامان کی صورتحال کو یقینی بنانا تھا۔یہ قانون دہشگردی اور تشدد کے خلاف ہر پاکستانی شہری کو سلامتی مہیا کرتا ہے۔تاہم اس قانون میں کچھ شقیں ایسی تھیں جنہوں نے انسانی حقوق کی تنظیموں کو پریشان کردیا۔حکومت نے تحفظ پاکستان آرڈیننس میں مزید تبدیلیاں کیں تاکہ اسے مزید شفاف بنایا جاسکے۔

2 جولائی 2014ء کو حکومت قومی اسمبلی میں بل لے کر آئی اور اپوزیشن جماعتوں کے تحفظات دور کرنے کی کوشش کی۔تاہم اس میں اب بھی کچھ شقیں ہیں جن پر انسانی حقوق کی تنظیموں اور اپوزیشن جماعتوں کے تحفظات ہیں۔مثال کے طور پر ایجنسیوں کے لوگ کسی بھی جگہ بغیر تحریری حکم نامے کے داخل ہوسکتے ہیں۔قانون نافذ کرنے والے ادارے کسی بھی مشتبہ شخص کو دیکھتے ہی گولی مار سکتے ہیں اس کیلئے انہیں پولیس کے 15 گریڈ یا اس سے اوپر کے آفیسر کی اجازت کی ضرورت ہے۔پہلی دفعہ اس قانون کے تحت موبائل فون کا ڈیٹا قابل قبول گواہی مانا گیا۔اگرچہ پارلیمنٹ نے اس بل کو منظور کرلیا۔اور اب اس کا نام تحفظِ پاکستان ایکٹ 2014ء ہے۔تاہم اپوزیشن جماعتوں کا کہنا ہے کہ حکومت نے ان تجاویز کو سنجیدہ نہیں لیا۔اور ان کی تجاویز کو اہمیت دیئے بغیر بل پاس کرلیا۔

اوپر بیان کردہ حقائق کے گہرے اثرات ہیں۔دہشتگردی کا مقابلہ کرنے والے قوانین مشکل اور ناقابل عمل سمجھے جاتے ہیں۔ اور یہ خدشہ بھی اپنی جگہ ہے کہ کوئی بندہ اپنے ذاتی مفاد کیلئے یہ اختیارات استعمال کرسکتا ہے۔ایک طرف دہشتگردی سماجی ومعاشی ترقی کو تباہ کررہی تھی تو دوسری طرف یہ غیر ملکی سرمایہ کاری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔تحفظِ پاکستان آرڈیننس 2014ء کے علاوہ حکومت نے قومی داخلی سلامتی پالیسی بھی بنائی جسے 2014ء میں وفاقی کابینہ نے منظور کیا۔تاہم قومی داخلی سلامتی پالیسی کی منظوری نے ملک میں نئی بحث چھیڑ دی۔ اس لئے اس پالیسی کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

موجودہ صورتحال اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر موجود خطرات کا تقاضا ہے کہ دنیا میں پاکستان قوموں کی برداری میں اپنا تشخص بہتر اور مستقبل کے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے کوئی پالیسی بنائے۔

### قومی داخلی سلامتی پالیسی (NISP) کا جائزہ:

پاکستان اندرونی دہشتگردی کا مقابلہ کرنے اور بین الاقوامی نظام کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کیلئے کیلئے اقدامات کررہا ہے۔۔اقوامِ متحدہ کی قرارداد 1373 (2001) میں بیان کیا گیا ہے کہ۔

اقوامِ متحدہ کی قرارداد 1624 (2005) نے یہ لازمی قرار دیا کہ تمام ممالک سلسلہ وار رپورٹ جمع کرائیں کہ انہوں نے دہشتگردی کے خلاف کیا اقدامات کئے ہیں۔اس لئے پاکستان کیلئے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ

دہشت گردی کے خلاف پالیسی بنائی جائے۔۔قومی داخلی سلامتی پالیسی کے مقاصد اور طریقہ کار بہت جامع ہے۔ یہ پالیسی بات چیت، ترقی، تحقیق، تعلیم کے ساتھ ساتھ ہم آہنگی اور معلومات کے تبادلے پر بہت زور دیتی ہے، اس پالیسی کے ذریعے حکومت نے دہشت گردی اور تشدد کے اندرونی عوامل کی شناخت کی، اس پالیسی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

**1۔ بات چیت کرنا 2۔ دہشت گردوں کو تنہا کردینا 3۔ ان کی مزاحمت کرنا**

اس پالیسی کا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ جامع ردعمل کی حکمت عملی (comprehensive response plan) کے بارے میں بات کرتی ہے جس میں بات چیت، ترقی، آبادکاری، معاشی وسماجی ترقی اور ذرائع آمدورفت کی ترقی کے عناصر شامل ہیں، پالیسی یہ واضح کرتی ہے کہ مختلف برادریوں اور نوجوانوں کو ترقی کے لیے متحد رکھنا سماجی ومعاشی ترقی کے لیے اہم عنصر ہے، قومی منظرنامے کی ترقی بھی اس کا ایک نرم پہلو ہے۔اس پالیسی نے نوجوانوں کو اہمیت دی کہ وہ ترقی کے کاموں میں حصہ لیں، اس مقصد کے لیے اس پالیسی کے تحت تعلیم میں سرمایہ کاری، پیشہ

ورانہ تربیت اور روزی کمانے کے لیے مختلف ہنر سکھانے پر زور دیا اور سرمایہ کاری کی جب کہ اس پالیسی کا سخت پہلو یہ ہے کہ اس پالیسی نے جامع دفاعی حکمت عملی (Composite Deterence Plan) متعارف کروائی جو انسدادی اور قابل عمل کارروائیوں پر مشتمل ہے، تاہم فوری اقدام ہر طرح کی دہشت گردی، تشدد اور فرقہ ورانہ کاروائیوں کا خاتمہ ہے، جامع دفاعی حکمت عملی کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وقت پر معلومات کا تسلسل اور باہمی تعاون کے طریقہ کار کو مضبوط کرنا ہے، یہ مقصد نیکٹا اور اس کے ذیلی محکمے اور داخلی سلامتی کے ڈائریکٹوریٹ (Directorate of Internal Secuarity) کے ذریعے حاصل کیا جائے گا۔

نیکٹا قومی داخلی سلامتی پلان کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوگا، یہ تمام اداروں کے درمیان اہم معلومات کے تبادلے اور باہمی تعاون کے طریقہ کار کو موثر بنائے گا، یہ صوبائی پولیس کے محکموں کے قریب ہو کے کام کرے گا اور FATA میں پولیس اور دوسرے اداروں کے ساتھ بھی محکمہ انسدادِ دہشتگردی صوبائی سطح پر نیکٹا کی کوششوں کو مضبوط کرنے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کرے گا۔ نیکٹا کی سربراہی وزیراعظم کریں گے اور اس میں اور بھی لوگ ہوں گے جیسا کہ خزانہ، دفاع، قانون وانصاف کے وزراء، تمام صوبوں کے وزرائے اعلیٰ، وزیراعظم آزاد جموں وکشمیر اور آئی ایس آئی اور ایم آئی کے ڈائریکٹر جنرلز، ان تمام معاملات کو فوجی وغیر فوجی سطح کا ایک اعلیٰ افسر دیکھے گا۔ وہ نیکٹا کو موثر تنظیم بنانے، جس میں تمام منصوبے شامل ہیں، اور تمام متعلقہ لوگوں کے درمیان باہمی تعامل کو مضبوط کرنے اور اس کو موثر انداز میں چلانے کا ذمہ دار ہوگا۔

## قومی داخلی سلامتی پالیسی کا تنقیدی جائزہ:

یہ پالیسی بڑی جامع ہے اور ایسے معاملات پر روشنی ڈالتی ہے جن پر پہلے کبھی کام نہیں ہوا، پالیسی تمام اندرونی سلامتی کے مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن پر قومی سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ معلومات کے تبادلے میں موجود خلاء کی نشاندہی کرتی ہے، سماجی ومعاشی ترقی کو سلامتی سے ملاتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ نظریاتی سوچ کا مقابلہ کرنے کے لیے سماجی ومعاشی ترقی سب سے اہم چیز ہے، تاہم اس پالیسی کے کچھ ایسے حصے بھی ہیں جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس پالیسی کو لاگو کرنا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ تمام اداروں کے درمیان باہمی تعاون بڑا مشکل کام ہے جبکہ اس پالیسی میں آئی ایس آئی کی شمولیت بھی واضح ہے۔ باہمی تعاون صوبائی پولیس اور انسدادِ دہشت گردی کے محکموں تک بڑھایا جائے گا۔

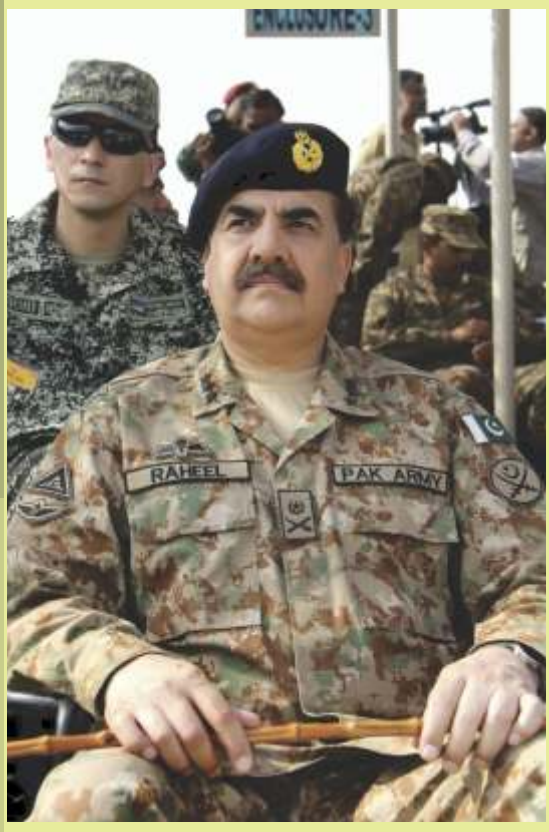


یہ بہت اچھی بات ہے کہ تعاون اس حد تک بڑھایا جائے لیکن یہ کیسے حاصل کیا جائے گا یہ ایک بڑا سوال ہے کیونکہ پولیس کا محکمہ صوبائی حکومت کے تحت کام کرتا ہے اور صوبائی حکومت ہی پولیس کو فنڈز دیتی ہے ہر صوبے میں پولیس کا انسپکٹر جنرل وزیراعلیٰ کو رپورٹ کرتا ہے اگرچہ وہ وفاق کا ملازم ہے۔ وزارت داخلہ مختلف مقاصد کے لیے 19 خفیہ اداروں کی نگرانی کرتی ہے۔ مزید برآں اختیارات کی منتقلی نے حالات بڑے پیچیدہ کر دیے ہیں کیونکہ صوبوں کا پولیس کے اوپر بہت زیادہ کنٹرول ہے۔

Rapid Response Force ایک دوسرا مسئلہ ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ایک ایسی فورس بنائی گئی ہے جو بہت تیزی سے کام کرتی ہے تاہم دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ فورس کیسے کام کرے گی اور وقت کتنا لے گی۔ فورس پولیس اور دوسرے خفیہ اداروں کے ساتھ

قومی داخلی سلامتی پالیسی پر تنقیدی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسے مزید سمجھنے اور مزید حقیقی بنانے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر قومی منظر نامے اور سوچ کو بدلنا بہت بڑا اور بہت مشکل کام ہے۔

کیسے تعاون کرے گی اور اس کا کام کرنے کا ڈھانچہ کیا ہوگا۔صرف نیا ادارہ بنا دینا ہی کافی نہیں جب تک یہ نہ دیکھا جائے کہ وہ موجودہ حالات میں کام کیسے کرے گا۔ایسا نیا ادارہ بنانا پولیس کے حوصلے پست کر سکتا ہے، جبکہ پولیس دہشت گردی کو روکنے اور امن وامان کی صورتحال برقرار رکھنے کے لیے بنیادی قوّت ہے۔ان اداروں کو فنڈز دینا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ پاکستان پہلے ہی معاشی اور بجلی بحران کا سامنا کر رہا ہے۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس بات کی گارنٹی کون دے گا کہ یہ فورس انتہائی اہم شخصیات کی حفاظت پر تعینات نہیں ہوگی جیسا کہ ہم پہلے ہی پنجاب میں الیٹ فورس کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں۔یہ پالیسی بہت سے طریقہ کار اور نئے ادارے اور تنظیمیں بنانے کی بات کرتی ہے۔سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ حکومت ان تمام نئے اداروں کو رقم کہاں سے دے گی جبکہ ان اداروں کی گنجائش اور قابلیت دوسرا اہم مسئلہ ہوگا۔ایف آئی اے کا انسدادِ دہشت گردی ونگ (CTW)، یو آئی سی، امریکہ اور اسٹریلیا کی مدد کے بغیر کوئی قابل اعتماد کام نہیں کر پایا۔پولیس کے محکمے کا حال بھی کچھ مختلف نہیں۔پولیس کی بڑے طریقے سے تنظیم سازی کی جاتی ہے، پرانا سامان ہے، تربیت ناقص ہے، سیاست زدہ ہے اور اوپر سے نیچے تک کرپٹ ہے۔

باوجود اس کے نیکٹا پالیسی کو لاگو کرنے کے لیے بڑے واضح ڈھانچے کا حامل ہے۔ تمام خفیہ اداروں کے درمیان معلومات کا تبادلہ، تحقیق، ترقی اور باہمی ہم آہنگی کے لیے یہ ادارہ سب سے اہم ہے۔تاہم بہت ہی زیادہ تجربہ کار افراد اور معاشی وسائل درکار ہیں جو کہ پاکستان کے پاس نہیں ہیں، اس کے ساتھ ساتھ قومی سلامتی سے متعلق ایک اور ادارہ ہے جس کا نام کابینہ کمٹی برائے قومی سلامتی ہے جس کی صدارت وزیر اعظم کرتے ہیں اور آرمی چیف بھی اس کمیٹی کے رکن ہوتے ہیں۔یہ فیصلہ سازی کا ادارہ ہے اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ نیکٹا کے ڈھانچہ کو واضح کیا جائے اور کابینہ کمیٹی برائے قومی سلامتی کے ساتھ اس کے کام کرنے کا تعلق کیسا ہوگا یہ بھی واضح ہونا چاہیے۔اگرچہ پالیسی بن گئی ہے اور نیکٹا وجود میں آ گیا ہے لیکن اب بھی قانونی طور پر بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ان سب باتوں میں انتہائی اہم بات یہ ہے کہ عسکری وسول قیادت کے باہمی تعلقات کیسے ہیں کیونکہ ماضی اس حوالے سے کچھ اچھا نہیں ہے، اس لیے ہمیں نتیجہ کا انتظار کرنا چاہیے۔

**تجاویز :**

قومی داخلی سلامتی پالیسی پر تنقیدی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسے مزید سمجھنے اور مزید حقیقی بنانے کی ضرورت ہے۔مثال کے طور پر قومی منظرنامے اور سوچ کو بدلنا بہت بڑا اور بہت مشکل کام ہے۔اس لیے کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے حکومت کو پالیسی کی وضاحت کرنی چاہیے۔اسی طرح مقصد حاصل کرنے کے لیے تعلیم، تربیت اور لوگوں کی فلاح کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔مزید برآں قومی منظرنامے اور سوچ کو بدلنے میں بہت وقت لگے گا۔ہوسکتا ہے کئی سال لگ جائیں اس کے علاوہ مقامی سوچ کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔

قومی داخلی سلامتی پالیسی کو لاگو کرنے کے لیے ایک اعلیٰ سطح کی غیر معمولی سیاسی قیادت کی ضرورت ہے نیکٹا تمام متعلقہ اداروں، وزارتوں اور فوجی اداروں سے کام نہیں لے پائے گا۔ماضی کے تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ سطح کی قیادت کے بغیر ایسے تجربات کامیاب نہیں ہوئے۔ نیکٹا اور سی این ایس کو ایک دوسرے میں ضم کر دینا چاہیے اور اس کی صدارت نائب وزیر اعظم کرے، پاکستان میں زرداری دور حکومت میں نائب وزیر اعظم کی روایت بھی ہے۔یہ تمام معاملات کو تیزی سے چلانے اور تمام ذمہ دار اداروں کے درمیان ہم آہنگی لانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

انسانی حقوق کے مسائل کو دیکھنے کے لیے حکومت یا وزارت داخلہ قانونی اور انسانی حقوق کے ماہرین پر مشتمل ایک باڈی بنائے۔اس ادارے کے ممبران ماہرین ہوں نہ کہ لیکٹوسٹ اور ان تمام ممبران کا رجحان کسی ایک فرد یا گروہ کی طرف نہ ہو۔ساتھ ساتھ فوجی وغیر فوجی تعلقات کو بھی مضبوط کیا جائے تاکہ اس پالیسی کے مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔آخر میں حکومت کو قومی داخلی سلامتی پالیسی کے بعض حصوں میں تحقیق اور عمل درآمد کے لئے سول سوسائٹی کی تنظیموں کو لازمی طور پر ساتھ ملانا چاہیئے تاکہ بیانیہ کو تبدیل اور تنازعہ کو حل کیا جا سکے۔اس کے ساتھ ہی سول، فوجی تعلقات کو بھی مضبوط بنایا جائے تاکہ پالیسی مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔

قومی داخلی سلامتی پالیسی کے بعض حصوں میں تحقیق اور عمل درآمد کے لئے سول سوسائٹی کی تنظیموں کو لازمی طور پر ساتھ ملانا چاہیئے تاکہ بیانیہ کو تبدیل اور تنازعہ کو حل کیا جا سکے۔اس کے ساتھ ہی سول، فوجی تعلقات کو بھی مضبوط بنایا جائے تاکہ پالیسی مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔

ایڈووکیسی

# پٹرول بحران سے حاصل ہونے والا سبق

ڈاکٹر عابد قیوم سلہری

حکومت کو پٹرول کے جاری بحران کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے عمل سے توجہ نہیں ہٹانی چاہیے۔

پٹرول کے حالیہ بحران کے بعد وزیراعظم توانائی کے شعبہ کے انتظام کے حوالہ سے خصوصی توجہ دے رہے ہیں جس سے پنجاب کے مختلف حصوں میں پٹرول کی فراہمی کی صورتحال بہتر ہوئی ہے تاہم اس بات کی تحقیق کرنا ضروری ہے کہ بحران پیدا ہونے کی وجوہات کیا تھیں اور مستقبل میں ایسے بحران سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے۔حالیہ کچھ ماہ میں پٹرول کی قیمتوں میں کمی آئی۔یہ رجحان اگلے کچھ ماہ تک برقرار رہنے کا امکان ہے اور پھر قیمتیں ایک سطح پر رک جائیں گی۔پی ایس او(PSO) جس کے پاس مارکیٹ کے 47 فیصد حصص ہیں کو مالی اور لاجسٹک مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے ذخائر خالی ہو گئے۔دوسری طرف پٹرول ذخیرہ کرنے والی دوسری کمپنیوں (OMCs) نے کسی بھی نقصان سے بچنے کے لیے (زیادہ قیمت پر پٹرول خرید کر کم قیمت پر فروخت کرنا) پٹرول کا کم سے کم ذخیرہ رکھا۔زخیرہ کرنے والوں اور ڈیلروں نے بھی ایسی صورتحال سے بچنے کے لیے پٹرول زیادہ مقدار میں ذخیرہ نہیں کیا۔ ایسے کاروباری فیصلوں کے باعث ملک میں پٹرول کے وافر ذخائر نہ ہونے کی صورتحال ظاہر ہوئی۔

پنجاب کے مختلف حصوں میں پٹرول کی فراہمی کی صورتحال بہتر ہوئی ہے۔

**سبق نمبر1۔** حکومت کو ایسے سیاسی فیصلے نہیں کرنا چاہیے کہ وہ آئندہ ماہ پٹرول کی قیمت میں کمی کر دے گی۔عالمی مارکیٹ میں پٹرول کی قیمت میں کمی کے فوائد عوام تک منتقل کیے جائیں گے۔پٹرول کی قیمت میں کمی کرنے کے پیشگی فیصلوں کے تیل منگوانے پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔

دوسرا یہ کہ: اوگرا (oil and gas regulatory authority) کو تیل کی دیگر کمپنیوں (OMCs) کے ساتھ مل کر بیس روز کا ذخیر رکھنا تھا یہ اتھارٹی روزانہ کی بنیاد پر ان کمپنیوں سے ذخیرہ کی صورتحال سے متعلق معلومات لیتی ہے اور ان ذخائر کی تصدیق کے لیے اوگرا کے پاس سیکڑوں افراد کی افرادی قوت بھی ہے۔تاہم اوگرا ملک میں اس بات کا اندازہ لگانے میں ناکام رہی کہ پٹرول کے ذخائر ڈیڈ لیول تک پہنچ چکے ہیں۔

**سبق نمبر2۔** ریگولیٹری اتھارٹی کو حقیقی طور پر خودمختار ہونا چاہیے مگر بدقسمتی سے پاکستان میں دیگر ریگولیٹری اتھارٹیز کی طرح اوگرا پر بھی ریٹائرڈ بیوروکریٹس کا قبضہ ہے۔اوگرا کے ممبر آئل کا عہدہ کچھ عرصہ سے خالی ہے اس لیے وزیراعظم کو اس عہدے پر کسی باصلاحیت اور تیل و گیس کے شعبہ کا تجربہ رکھنے والے شخص کو تعینات کرنا چاہیے تاکہ یہ اتھارٹی موثر انداز میں کام کر سکے

تیسرا یہ کہ: پراڈکٹ ریویو اور کوآرڈینیشن کمیٹی۔۔۔اس کمیٹی کے اجلاس کی صدارت وزارت پٹرولیم کے ڈی جی آئل نے کی۔اجلاس ہر پندرہ روز بعد ملک میں ایندھن کے استعمال، ممکنہ دستیابی، فراہمی میں کمی اور اس پر قابو پانے کے حوالہ سے مستقبل کا تخمینہ پیش کرتا ہے۔اگرچہ یہ اجلاس باقاعدگی سے ہوئے تاہم کمیٹی تیل کی قیمتوں میں کمی اور سی این جی کی موجودگی کے باوجود ملک میں تیل کے استعمال کی بڑھتی ضروریات کا اندازہ نہ لگا سکی۔

وزارت پٹرولیم و قدرتی وسائل، وزارت پانی و بجلی اور وزارت خزانہ کے درمیان کمزور رابطوں کے نقصان کا خمیازہ پی ایس او کو بھگتنا پڑا۔

**سبق نمبر3۔** وزاتوں میں شواہد پر مبنی فیصلہ سازی کو موثر بنانے کی ضرورت ہے۔اگر فیصلے حقیقی اعداد و شمار کی بنیاد پر نہیں کیے جائیں گے تو ایسے بحران پیدا ہوتے رہیں گے۔

چوتھا یہ کہ: پاک عرب ریفائنری کی بندش۔۔پارکو(PARCO) جو کہ پٹرول فراہم کرنے والی دیگر کمپنیوں (OMCs) میں شامل ہے گیارہ کلو وولٹ پاور ٹرانسمیشن لائن کے ٹرپ کرنے سے کچھ دن بند رہا۔اس وجہ سے تیل کی فراہمی کا عمل چار سے پانچ دن متاثر ہوا

**سبق نمبر4۔** صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لیے دوسری حکمت عملی یا پلان بی نہ ہونے سے ایسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔ہمیں بالائی

پنجاب اور خیبر پختونخوا میں اپریل 2015 سے ڈیزل کے وسائل پر انحصار کرنا چاہیے۔اٹک آئل ریفائنری جو کہ پاکستان کے ان علاقوں کو ڈیزل فراہم کرتی ہے اپریل 2015 سے تین ماہ کے لیے مرمت اور دیگر امور کی وجہ سے تین ماہ بند رہے گی۔

پانچواں یہ کہ: صارفین کا طرز عمل۔۔یہ اطلاع کہ پٹرول کچھ عرصہ کے لیے دستیاب نہیں ہوگا عوام میں بے چینی کا باعث بنتا ہے اور لوگ ہنگامی ضروریات کے لیے پٹرول خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔پٹرول فروخت کرنے والوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا اور پٹرول تین سو روپے فی لٹر تک فروخت کیا۔

**سبق نمبر 5۔** حکومتی افراد کی بے پناہ تعداد اور حکمرانی کے فقدان نے ذخیرہ اندوزوں کو صارفین کا استحصال کرنے کی کھلی چھٹی دیدی۔اگر ضلعی انتظامیہ ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کارروائی کرتی تو پٹرول کی کمی کے بہت سے بالواسطہ نقصانات سے بچا جا سکتا تھا۔

چھٹا یہ کہ: پاکستان سٹیٹ آئل (PSO) کے ٹریلین روپے سے بھی زائد کے اثاثے ہیں اور گزشتہ سال کمپنی نے 42 ارب روپے منافع کمایا۔کمپنی پٹرول فراہمی کے 47 فیصد حصص کی مالک ہے اور واحد آئل مارکیٹنگ کمپنی ہے جو سرکاری بجلی گھروں، پی آئی اے، پاکستان ریلوے اور دیگر اداروں کو ادھار ایندھن فراہم کر سکتی ہے۔تاہم پی ایس او کو مالی مشکلات کا سامنا ہے کمپنی کو انتظامی اور انسانی وسائل کے حوالہ سے بھی مشکلات کا سامنا ہے۔

پچھلے بیس ماہ سے ادارہ کو قائم مقام مینیجنگ ڈائریکٹر کے ذریعہ چلایا جا رہا ہے۔ قائم مقام ایم ڈی کو یہ ذمہ داری ابتدائی طور پر تین ماہ کے لیے دی گئی تھی ۔ایم ڈی اور ان کے کئی سینئر مینجرز سمیت کوئی بھی عملی طور پر فعال نہیں، کیونکہ یہ سب ایم ڈی کے مستقل عہدے کے لیے امیدوار بھی تھے۔ایسی صورتحال میں اہم فیصلوں میں تاخیر ہو رہی تھی اور ان میں پاکستان نیشنل شپنگ کارپوریشن (PNSC) کے فریٹ چارجز پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ بھی شامل تھا۔پی ایس او اور پی این ایس سی کے درمیان معاہدے کے مطابق فریٹ چارجز پر نظر ثانی جنوری 2014 میں ہونا تھی مگر دونوں اداروں میں ریٹ پر اتفاق نہ ہونے کے باعث معاملہ عدالت میں چلا گیا اور اب دونوں ادارے عدالتی ہدایات کی روشنی میں ایک دوسرے کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔آئل کے نظام میں پٹرول کے (آٹھ سے دس دن) تاخیر سے شامل ہونے نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا اور بحران مزید سنگین ہو گیا۔

یہ وقت ہے کہ ہم تمام بحرانوں پر بیک وقت بات کریں۔

**سبق نمبر 6۔** سٹریٹجک اداروں مثلاً پی ایس او کو ایڈہاک بنیادوں پر نہیں چلایا جا سکتا۔حکومت کو اس میں کل وقتی اور آئل انڈسٹری کا تجربہ رکھنے والا ایم ڈی تعینات کرنے کی ضرورت ہے۔قائم مقام ایم ڈی کے خلاف اگرچہ کسی قسم کا تعصب نہیں مگر وہ بھی آئل انڈسٹری سے تعلق نہیں رکھتے اور ان کی جگہ کل وقتی ایم ڈی تعینات کیا جانا چاہیے۔

**سبق نمبر 7۔** پی ایس او کو صرف ایک شپنگ کمپنی پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔پی ایس او اور پی این ایس سی کے درمیان معاہدے پر فریقین کو لچک کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر ثانی کرنی چاہیے تاکہ مستقبل میں لاجسٹک کے مسائل پیدا نہ ہوں۔۔

ساتواں یہ کہ: پی ایس او کی مالی پوزیشن۔۔پی ایس او اگرچہ ٹریلین روپے سے زائد کے اثاثے رکھنے والی کمپنی ہے تاہم وہ بھی مالی مشکلات کا شکار ہے۔پچھلے جون تک کمپنی نے 200 ارب روپے وصول کرنا تھے جن میں سے 176 ارب روپے بجلی کے شعبہ نے دینے تھے۔نیشنل ٹرانسمیشن اور ڈسٹری بیوشن کمپنی (NTDC) نے پی ایس او کو 99.3 ارب روپے، حبکو نے 58 ارب روپے، کیپکو نے 13.6 ارب روپے، صبا پاور اینڈ سدرن الیکٹرک نے 759 ملین روپے ادا کرنے ہیں۔۔

**سبق نمبر 8۔** ایسا کاروبار کہ قرض پر مصنوعات خریدی جائیں اور ایک غیر معینہ مدت کے لیے قرض پر فروخت کی جائیں کی مثال ملنا ممکن نہیں جبکہ اصل مالک کو مصنوعات کی قیمت مارکیٹ میں وقت پر مل سکتی ہو۔

وزارت پٹرولیم وقدرتی وسائل، وزارت پانی وبجلی اور وزارت خزانہ کے درمیان کمزور رابطوں کے نقصان کا خمیازہ پی ایس او کو بھگتنا پڑا۔موجودہ بحران سے سبق سیکھتے ہوئے ہمیں آئندہ کے بجٹ میں توانائی سے متعلق حقائق پر مبنی سبسڈی مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔یہ رقم این ٹی ڈی سی اور بجلی پیدا کرنے والی کمپنیوں کو دی جانی چاہیے جو یہ رقم فرنس آئل کے لیے پی ایس او کو پیشگی ادا کریں۔ہر صوبے کو فراہم کی گئی بجلی کی قیمت جزوی طور پر اس صوبے کو این ایف سی کی مد میں ملنے والی رقم کے بدلے میں ایڈجسٹ کی جانی چاہیے۔

آٹھواں یہ کہ: گردشی قرضہ۔ گردشی قرضے میں تقریباً بارہ ادارے ملوث ہیں۔ان میں آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کارپوریشن (OGDC) اور پاکستان پٹرولیم (PPL) جو ریفائنریز کو خام تیل فراہم کرتی ہیں اور پانچ ریفائنریز، جن میں پاک عرب ریفائنری (PARCO)، پاکستان ریفانئری (PRL) نیشنل ریفائنری (NRL)، اٹک ریفائنری (ARL) اور بی وائے سی او (BYCO) شامل ہیں یہ ریفائنریز پی ایس او اور کبھی کبھار جنکوز کو تیل بیچتی ہیں

بجلی تقسیم کرنے والی کمپنیاں جنکو (GENCO) سے بجلی خرید کر صارفین کو فروخت کرتی ہیں۔یہ کمپنیاں پیداواری لاگت وصول نہیں کر سکتیں۔ریفائنریز او جی ڈی سی، پی پی ایل اور حکومت کو بروقت ادائیگی نہیں کرتیں اور قرضے کا عمل جاری رہتا ہے۔اس لیے اگر ہم نے گردشی قرضوں سے وسط اور لمبی مدت کے لیے نجات حاصل کرنا ہے تو پھر بنیادی اقدامات کرنا ہوں گے۔

## حتمی کلمات۔

ہم بحرانوں پر حساس ہو جاتے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ اقدامات کرتے ہیں تو مختلف نوعیت کے کسی دوسرے بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔یہ بحران ہماری توجہ پہلے والے بحران سے ہٹا دیتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔یہ وقت ہے کہ ہم تمام بحرانوں پر بیک وقت بات کریں۔پٹرول کے موجودہ بحران پر پالیسی سازوں کی پشاور سانحہ سے توجہ نہیں ہٹنی چاہیے اور پٹرول کے مسئلے کو مستقل بنیادوں پر حل کرنے کی راہ میں بجلی کا جاری بحران بھی رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے۔

پٹرول کے موجودہ بحران پر پالیسی سازوں کی پشاور سانحہ سے توجہ نہیں ہٹنی چاہیے اور پٹرول کے مسئلے کو مستقل بنیادوں پر حل کرنے کی راہ میں بجلی کا جاری بحران بھی رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیے۔

پٹرول کی قیمتوں میں پھر اضافہ

پالیسی ری ویو

# پاکستان میں منصفانہ مالیاتی پالیسی کی طرف ایک قدم

ڈاکٹر وقار احمد، مصطفیٰ تالپور اور صدف لیاقت

"معاشی ترقی عوام کی زندگیوں پر جزوی طور پر اثر انداز ہوتی ہے تاہم معاشی ترقی سے حاصل ہونے والی آمدن ان کی زندگیوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔"

dre'ze and Sen(2013)

پاکستان کا موجودہ ٹیکس نظام غیر منصفانہ ہے اور ضروریات پوری نہیں کرتا۔

پاکستان میں عوامی خدمات جن میں صحت، اور تعلیم بھی شامل ہے اور جن پر غریب زیادہ انحصار کرتے ہیں، کے لیے درکار مالی ضروریات پوری کرنے کے لیے ٹیکس آمدن میں سے مکمل وسائل نہیں ملتے جس کے نتیجے میں یہ خدمات ناکافی رہتی ہیں اور اس سے غربت اور انتہائی عدم مساوات کو کم کرنے کی کوششیں متاثر ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ پاکستان کا موجودہ ٹیکس نظام غیر منصفانہ ہے اور ضروریات پوری نہیں کرتا۔ دو تہائی ٹیکس آمدن بالواسطہ ٹیکس نظام سے حاصل ہوتی ہے جو کہ غریب اور مڈل کلاس پر فطرتاً ایک جبری ٹیکس اور بوجھ ہے

## پس منظر

یہ تاثر ابھر رہا ہے کہ پاکستان میں آمدن اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے سماجی اور معاشی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ جس میں تشدد، سیاسی عدم استحکام اور سماجی دھڑے بندی شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماہرین میں یہ تاثر بھی پیدا ہو رہا ہے کہ پاکستان کی مالیاتی پالیسی آمدن کی ازسرِنو تقسیم سے قاصر ہے۔ 2014 میں سرکاری شعبہ سے حاصل ہونے والی کل آمدن جی ڈی پی کا 9.8 فیصد تھی جو کہ ابھرتی معیشتوں میں کم ترین ہے۔ ملکی وسائل کے انتہائی کم استعمال سے ظاہری طور پر تین اثرات نظر آتے ہیں۔ پہلا، ضروری عوامی خدمات، جن میں بنیادی تعلیم، صحت اور پینے کے صاف پانی کی فراہمی شامل ہیں اور جن پر معاشرے کا غریب ترین طبقہ انحصار کرتا ہے۔ دوسرا، حکومت ضروری اخراجات پورے کرنے کے لیے اندرونی و بیرونی وسائل سے قرض لیتی ہے تو سرکاری قرضوں کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ حکومت کا یہ عمل مستقبل کے ٹیکس بوجھ کے تناظر میں معیشت کو چاروں شانے چت کرنے کے مترادف ہے، تیسرا، حکومت کو بینکنگ شعبہ سے قرضہ لینا پڑتا ہے اور اس عمل سے نجی شعبہ کے لیے قرضہ لینے کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت پانچ لاکھ افراد رضاکارانہ طور پر ٹیکس گوشوارے بھرتے ہیں۔

دولت کا ایک بڑا حصہ جس میں جائیداد بھی شامل ہے ٹیکس نیٹ ورک میں شامل نہیں جبکہ ٹیکس چھوٹ، استثنیٰ، اشیاء کی خریداری لاگت میں اضافہ اور متعلقہ ٹیکسوں میں کمی اور ٹیکسوں کے مجموعی ٹیکس ڈھانچے میں سے زرعی اور خدمات کے شعبہ جات کو ٹیکسوں میں نرمی دینے سے بھی ٹیکس نیٹ ورک کو بڑھانے کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو (FBR) کے اپنے سروے میں ایک اندازے کے مطابق ٹیکس دینے اور نہ دینے والوں میں فرق 79 فیصد ہے۔ صوبائی حکومتوں کو ٹیکس آمدن بڑھانے کے لیے کوششیں کرنا چاہئیں ابھی وہ صرف پاکستان میں جمع ہونے والے ٹیکس کا 6.5 فیصد جمع کرتی ہیں۔

پس منظر میں بیان کی گئی وجوہات کے ساتھ ساتھ یہ دستاویز ایک منصفانہ ٹیکس نظام کے لیے چار بنیادی اجزا کی وضاحت بھی کرے گی جن پر، اگر

عمل ہو جائے، تو ملکی ٹیکس دینے والوں کا دائرہ کار بڑھنے کے ساتھ ساتھ ٹیکس دینے والے تمام شعبوں میں مساوات بھی پیدا ہو گی اور اس کا مجموعی نتیجہ بھی بہتر نکلے گا کیونکہ سرکاری شعبہ کو انسانوں اور سماج کی بھلائی کے لیے زیادہ وسائل دستیاب ہوں گے۔

**1۔۔ٹیکس بیس (براہ راست) کو وسعت دینا**

براہ راست ٹیکس نیٹ ورک میں توسیع کی راہ میں حائل رکاوٹوں میں پیداواری شعبہ میں دی گئی مختلف ٹیکس چھوٹوں اور ود ہولڈنگ ٹیکس (Withholding Tax۔۔۔WHT) کو بڑھانے پر زیادہ انحصار شامل ہے جو کہ چھوٹے کاروبار کرنے والوں پر خاص طور پر ایک بوجھ ہے۔ود ہولڈنگ ٹیکس (WHT) کے نتیجے میں اشیا اور خدمات کی لاگت بڑھ جاتی ہے جو کہ صارفین کو ادا کرنا پڑتی ہے۔لاگت میں اضافہ چھوٹے کاروبار کرنے والوں کی ایک تعداد کو باضابطہ دستاویزی معیشت پر عملدرآمد سے روکتا ہے۔پاکستان میں غیر دستاویزی معاشی کاروبار کرنے والوں کی تعداد کے حوالہ سے مختلف تخمینے لگائے گئے ہیں تاہم ماہرین میں یہ اتفاق پایا جاتا ہے کہ ایسا معاشی کاروبار کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

پاکستان میں اس وقت پانچ لاکھ افراد رضا کارانہ طور پر ٹیکس گوشوارے بھرتے ہیں۔پالیسی انسٹی ٹیوٹ برائے پائیدار ترقی (SDPI) کے 2013 میں کیے گئے ایک گھریلو سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ 71 فیصد ٹیکس دینے کے قابل افراد صرف اس لیے ٹیکس نہیں دیتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ کمزور انتظامیہ ٹیکس آمدن کا درست انداز استعمال کرنے کی اہل نہیں۔سروے میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ چالیس فیصد لوگ ٹیکس افسران کی طرف سے حراساں اور مداخلت کرنے کے خوف، 29 فیصد ٹیکس پر عملدرآمد کی مدت میں کمی اور 37 فیصد آمدن کے غلط اعداد و شمار کے ذریعہ ٹیکس بچانے کے لیے ٹیکس افسران کو رشوت کے طور پر تحائف دیتے ہیں۔

ٹیکسوں کا غیر موثر آڈٹ نظام، کئی اقسام کے ٹیکسوں کی بھرمار، قابل ٹیکس آمدن کا تخمینہ لگانے میں مشکلات، ٹیکس ادائیگی کے لیے سہولیات کی فراہمی کا نامناسب نظام اور ٹیکس دہندہ اور وصول کنندہ میں تعلق کا فقدان پاکستان میں ٹیکس سے بچنے کی بڑی وجوہات ہیں۔اس سے شہریوں اور ریاست میں سماجی معاہدے میں توڑ پھوڑ بھی ظاہر ہوتی ہے۔کیونکہ ریاست یہ ثابت نہیں کر پاتی کہ ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی رقم عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوتی ہے۔کاروباری شعبہ ٹیکس بچانے کے لیے جارحانہ اقدامات کرتا ہے، احمد اور رائیڈر (Ahmed and Rider) کی طرف سے 2013 میں نشاندہی کیے گئے ٹیکس فرق میں کاروباری شعبہ کا حصہ 25 فیصد بنتا تھا۔کمال (2010) نے بتایا کہ کارپوریٹ ادارے کس طرح زراعت اور دیگر وسائل سے حاصل ہونے والی رقم کے ایک بڑے حصے کو ٹیکس سے چھوٹ یا ایسے شعبوں میں شامل کرتے ہیں جن پر زیرو ٹیکس ہوتا ہے۔ٹیکس پالیسی میں خامیاں کاروبار کرنے والوں کو ٹیکس سے استثنیٰ کی راہ دکھاتی ہیں اور کاروباری شعبہ سماجی ذمہ داریوں کے نام پر ایسے ان اقدامات کا سہارا لیتا ہے جو کہ ٹیکس کے دائرہ کار میں نہیں آتے

مستقبل میں آئی سی ٹی (ICT) کے استعمال، بائیومیٹرک معلومات اور نادرا سے منسلک ڈیٹا ویئر ہاؤس کی بدولت ٹیکس حکام ان افراد کو بھی ٹیکس نیٹ ورک میں لا سکیں گے جو ابھی تک ٹیکس نہیں دے رہے تھے، صوبائی حکومتوں کو بھی جائیدادوں، سرمایہ کاری اور جائیدادوں کو کرائے پر دینے کی مد میں ٹیکس آمدن بڑھانے کا موقع ملے گا اور وہ بھی موثر ٹیکس دور میں داخل ہو سکیں گی۔

اٹھارہویں ترمیم کے بعد سماجی شعبہ میں خدمات کا شعبہ صوبائی حکومتوں کی ذمہ داری قرار پایا۔اس لیے صوبائی ریونیو اتھارٹیز نے ٹیکس آمدن میں سے حصہ بھی مانگنا شروع کر دیا ہے، یہ اہم بات ہے کہ شہریوں کو بتایا جائے کہ حکومتی وسائل کس طرح خرچ کیے جا رہے ہیں اور یہ ٹیکس دینے والے صارفین کا اعتماد بحال کرنے کی طرف ایک قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

ٹیکسوں کا غیر موثر آڈٹ نظام، کئی اقسام کے ٹیکسوں کی بھرمار، قابل ٹیکس آمدن کا تخمینہ لگانے میں مشکلات، ٹیکس ادائیگی کے لیے سہولیات کی فراہمی کا نامناسب نظام اور ٹیکس دہندہ اور وصول کنندہ میں تعلق کا فقدان پاکستان میں ٹیکس سے بچنے کی بڑی وجوہات ہیں۔

## 2۔ بالواسطہ ٹیکسوں میں کمی

لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) اور آکسفیم (OXFAM) کی طرف سے پاکستان میں عدم مساوات کے حوالہ سے کی گئی حالیہ تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ ایف بی آر (FBR) کی 60 فیصد آمدن بالوواسطہ ٹیکسوں سے حاصل ہوتی ہے جو کہ فطرتاً ایک جبری ٹیکس ہے۔ٹیکسوں کا موجودہ نظام ایسا ہے کہ اس پر عمل سے امراء کی آمدن بڑھتی ہے جبکہ غربا کی آمدن کم ہو جاتی ہے

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عدم مساوات کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔۔

الف۔۔وفاقی ایکسائز ڈیوٹی کو مرحلہ وار ختم کرنا

ب۔۔جنرل سیلز ٹیکس کی ادائیگی کے نظام کو آسان بنانا اور بتدریج کم کرنا

پ۔۔کسٹم ڈیوٹیوں کی شرح کو مزید کم کرنا اور ٹیرف درجہ بندیوں کو کم کرنا

پاکستان میں ٹیکس کی صورتحال کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بالواسطہ ٹیکسوں میں کمی سے فلاح و بہبود سے متعلق اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔غربا اور مڈل کلاس آمدنی والے گروہوں کو فوری ریلیف دینے کے لیے خوراک اور ایندھن، کھانا پکانے کا تیل، ڈبل روٹی، دودھ ،سبزیاں، پھل، چائے اور چینی شامل ہیں جنہیں غریب استعمال کرتے ہیں، کو سیلز ٹیکس سے استثنیٰ دے دیا جائے۔

ایک تشویش یہ بھی ہے کہ تین صوبائی حکومتوں نے سروسز ایکٹ پر جنرل سیلز ٹیکس نافذ کر رکھا ہے۔ایک آزاد تحقیق کے مطابق قانون سازی کے نتیجہ میں مختلف خدمات پر دوہرا ٹیکس نافذ ہے کیونکہ وفاقی حکومت اپنے دائرہ کار میں آنے والی خدمات پر ود ہولڈنگ ٹیکس ختم کرنے میں سستی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔کم از کم دو صوبوں نے اپنی نوعیت کا ایکسائز اور ریگولیٹری ڈیوٹیز عائد کر دی ہیں۔ مختلف اقسام کے ٹیکسوں کی وجہ سے بھی مجموعی ٹیکس نظام کی ساکھ متاثر ہوئی ہے۔

وفاقی حکومت نے ستمبر 2014 میں ٹیکس ریفارمز کمیشن قائم کیا جو پہلے ہی (بالواسطہ ٹیکس کے تناظر میں) کہہ چکا ہے کہ اسمگلنگ، جعلی انوائسز، انڈر انوائسز، غیر قانونی ایڈجسٹمنٹ اور ٹیکس ریفنڈز کی ادائیگی میں تاخیر جیسے مسائل موجود ہیں۔یہ مسائل باضابطہ کاروبار کی راہ میں لاگتی اخراجات بڑھاتے ہیں جن کو صارف کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں صارف کی فلاح متاثر ہوتی ہے۔

دیگر معیشتوں کی کچھ مثالیں موجود ہیں جہاں کی حکومتوں نے بالواسطہ ٹیکسوں میں کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والے فرق کو براہ راست ٹیکس نیٹ ورک میں اضافے کے ذریعہ پورا کیا ہے۔اس حوالہ سے اہم مثال ترکی کی ہے جس نے 1995 سے 2006 کے دوران بالواسطہ ٹیکس آمدن کو کم کرتے ہوئے اپنی ٹیکس آمدن کو جی ڈی پی کی شرح کے دوگنا کیا۔2002 میں ترکی کی حکومت نے 16 بالواسطہ ٹیکس ختم کر دیئے اور زیادہ آمدن والے گروہ کے زیر استعمال اشیا پر ایک خصوصی consumption ٹیکس عائد کر دیا، یعنی جائیداد، وارثت اور قیمتی تحائف جیسے شعبوں پر ٹیکس کی شرح بڑھا دی۔ماحولیاتی ٹیکس عائد کیا گیا تا کہ سماجی شعبے کے لیے مالی اخراجات پورے کیے جا سکیں۔

## 3۔۔تمام شعبوں پر مساوی ٹیکس کا اطلاق

ٹیکسوں کے ایک منصفانہ نظام میں تمام شعبہ جات قومی آمدنی میں اپنے حصہ کا ٹیکس ادا کرتے ہیں تاہم موجودہ نظام میں کچھ معاشی شعبے زیادہ ٹیکس ادا کرتے ہیں جبکہ باقی کم ٹیکس دیتے ہیں۔اس وقت صنعتی شعبہ زرعی اور خدمات کے شعبہ کے مقابلے میں بہت زیادہ ٹیکس دے رہا ہے۔زرعی اور دیگر شعبہ جات پر ٹیکسوں میں دی گئی رعایتوں کا از سر نو جائزہ لیا جانا چاہیے۔خدمات کی صنعت کے نئے ذیلی شعبوں جن میں نجی تعلیمی ادارے، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور الیکٹرانک میڈیا کے ادارے بھی شامل ہیں کو بھی ٹیکس نیٹ ورک میں لایا جانا چاہیے۔

پاکستان میں عدم مساوات کے حوالہ سے کی گئی حالیہ تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ ایف بی آر (FBR) کی 60 فیصد آمدن بالوواسطہ ٹیکسوں سے حاصل ہوتی ہے جو کہ فطرتاً ایک جبری ٹیکس ہے۔

ٹیکسوں میں چھوٹ کا موجودہ نظام بھی جی ڈی پی شرح پر ٹیکس آمدن کی کم وصولی کی ایک بڑی وجہ ہے اور جہاں چھوٹ اور رعایتیں صرف مخصوص شعبوں اور تنظیموں کے لیے ہوں تو اس کے فوائد عام صارف تک منتقل نہیں ہوتے 14-2013 میں مجموعی طور پر 477 ارب روپے کی ٹیکس چھوٹ دی گئی جو کہ جی ڈی پی شرح کا دو فیصد بنتی ہے (گراف نمبر۔1) 2014 میں سیلز ٹیکس استثنیٰ کی مد میں 211 ارب روپے جبکہ کسٹم ڈیوٹی میں 31 ارب روپے کی چھوٹ دی گئی جو کہ پچھلے سال کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ زراعت اور لائیو اسٹاک شعبہ کے بڑے کاروبار کرنے والوں پر ٹیکس چھوٹ کے بتدریج خاتمے سے حکومت کو ٹیکس آمدنی میں 115 ارب روپے اضافی مل سکتے ہیں۔

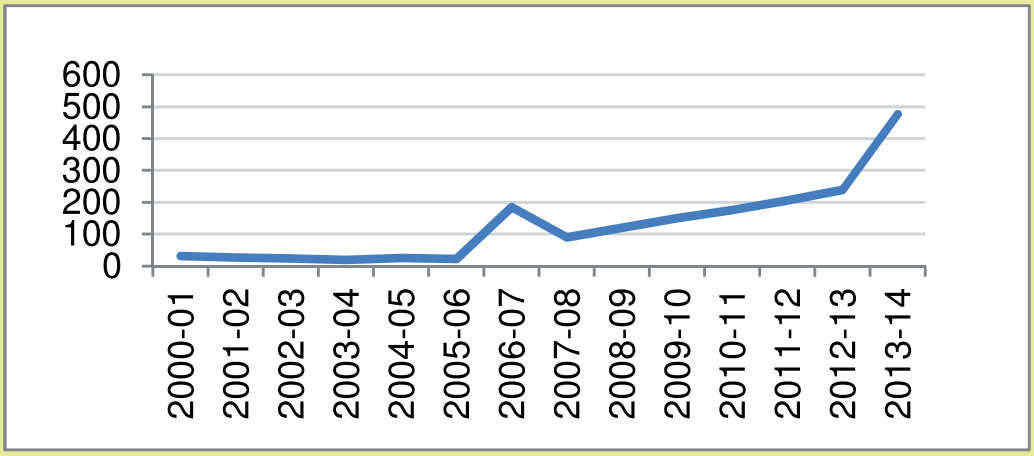


*Source: Multiple Inequalities and Policies to Mitigate Inequality Traps in Pakistan, Oxfam and LUMS*

ٹیکس انتظامیہ کو عوام اور ریاست کی موثر حمایت حاصل نہیں ہوتی اس لیے شہریوں اور ریاست میں سماجی تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے قانون سازی کی جانی چاہیے۔

ایف بی آر (FBR) کی طرف سے ٹیکس وصولیوں اور اخراجات میں فرق کے حوالہ سے کیے گئے سروے کے مطابق خدمات کا شعبہ جو جی ڈی پی کا ساٹھ فیصد بنتا ہے کے بارے میں غلط تخمینہ لگایا جاتا ہے۔ اب خدمات کے نئے شعبے پروان چڑھ رہے ہیں جن کو اسی صورت ٹیکس نیٹ ورک میں لایا جاسکتا ہے جب وفاقی اور صوبائی ایف بی آر دفاتر سروسز کے حوالہ سے نیا سروے کریں۔ حکومت مستقبل میں ٹیکس چھوٹ اور رعایت کے حوالہ سے فنانس ایکٹ کے ذریعہ ڈگری لے سکتی ہے یا پھر پارلیمنٹ میں یا متعلقہ قائمہ کمیٹیوں میں معاملہ پر بحث کرا سکتی ہے تاکہ چھوٹ اور رعایت کے معاملہ کی مکمل طور پر حوصلہ شکنی کی جاسکے۔ مستقبل میں ٹیکس استثنیٰ دینے کی منظوری دیتے ہوئے اس بات کی تصدیق کی جانی چاہیے کہ استثنیٰ سے غربت اور عدم مساوات کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔ قائمہ کمیٹیوں کو کوئی بھی ایس آر او (Statutory Regulatory Order) جاری کرنے سے پہلے معاشی اور قانونی ماہرین سے مشاورت کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔

## 4۔ ٹیکس انتظامیہ میں اصلاحات

ٹیکس پالیسی کی تیاری اور ٹیکس کی وصولی کے عمل کو الگ الگ رکھا جانا چاہیے۔ پالیسی بنانے کی ذمہ دار پارلیمنٹ یا متعلقہ کمیٹیاں ہونی چاہئیں۔ ٹیکس پالیسی مجموعی مالیاتی پالیسی کو مدنظر رکھ کر ایک منصفانہ اور معاشرے کے قیام کے مقصد کے لیے بنائی جانی چاہیے جس میں ملکی وسائل غریب طبقہ پر خرچ ہوسکیں۔ ٹیکس انتظامیہ ایک خودمختار ادارہ کی شکل میں ہونی چاہیے جو اس سوچ پر عمل کر سکے۔

ٹیکس انتظامیہ کو عوام اور ریاست کی موثر حمایت حاصل نہیں ہوتی اس لیے شہریوں اور ریاست میں سماجی تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے قانون سازی کی جانی چاہیے۔ یہ تجویز بھی ہے کہ ایف بی آر اور صوبائی ٹیکس انتظامیہ کو زیادہ خودمختاری دی جانی چاہیے۔ اس سے ٹیکس اداروں کو اپنی افرادی قوت رکھنے اور انتظامی ڈھانچے کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔ ریونیو اتھارٹیز میں بھرتیوں، ترقیوں اور انعام دینے کے عمل میں کسی قسم کی سیاسی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ اتھارٹیز کی استعداد کار بڑھانے میں مدد کی جانی چاہیے۔ اور یہ اسی صورت ممکن ہے جب ٹیکس کے محکمے وسط

مدتی اسٹریٹجک پلانز تیار کریں اور پھر اس پر عملدرآمد کی نگرانی کے لیے نظام بنائیں۔صوبائی ٹیکس حکام کو اپنا ڈیٹا بیس تیار اور زراعت، خدمات اور رئیل اسٹیٹ کے شعبوں سے متوقع آمدن کا باقاعدہ تخمینہ لگانے کی صلاحیت کا حامل ہونا چاہیے۔

ایسے ٹیکسوں کا جائزہ لیا جانا چاہیے جن کی وصولی پر آمدن کے مقابلے میں زیادہ اخراجات اٹھتے ہوں۔ایسے ٹیکسوں کو ایک منظّم دھارے میں لایا جانا چاہیے اور پھر بتدریج ختم کر دیا جانا چاہیے۔آمدن میں ہونے والے کسی بھی ایسے نقصان کو براہ راست ٹیکسوں کے ذریعہ پورا کرلیا جائے۔

## اختتامیہ کلمات

پاکستان میں ٹیکسوں کا موجودہ نظام غیر موثر اور غیر منصفانہ نظام ہے۔۔جی ڈی پی کی شرح کے تحت لی جانیوالی ٹیکس آمدن کم رہتی ہے۔ براہ راست ٹیکسوں کے ذریعہ غربا پر بوجھ بڑھا کر امرا کو سہولتیں دی جاتی ہیں اور یہ نظام عوامی خدمات مثلاً صحت، تعلیم، پینے کا صاف پانی اور نکاسی وغیرہ کے لیے زیادہ وسائل بھی فراہم نہیں کرتا۔اس دستاویز میں ایک منصفانہ اور شفاف پالیسی کے لیے چار اجزا کی تفصیل بتائی گئی ہے جس کی مدد سے پاکستان کے ٹیکس نظام کو زیادہ موثر اور مساوی بنایا جاسکتا ہے۔ان اجزا کی مدد سے براہ راست ٹیکس کو بڑھا کر ٹیکس دہندگان کے دائرہ کار کو بڑھایا جاسکتا ہے، غربا کو متاثر کرنے والے بالواسطہ ٹیکسوں کی تعداد کو کم کیا جاسکتا ہے، ٹیکس آمدن میں معیشت کے مختلف شعبوں کی مساوی اور منصفانہ شراکت اور ٹیکس انتظامی اصلاحات پر عملدرآمد کیا جاسکتا ہے۔ان اجزا پر عمل ہونے سے پاکستان میں معاشی عدم مساوات کے بڑھتے رجحان کو بدلنے میں بھی مدد مل سکتی ہے

ٹیکس انتظامیہ کو عوام اور ریاست کی موثر حمایت حاصل نہیں ہوتی اس لیے شہریوں اور ریاست میں سماجی تعلق کو مضبوط بنانے کے لیے قانون سازی کی جانی چاہیے۔


ایس ڈی پی آئی، سلسلہ مطبوعات-6

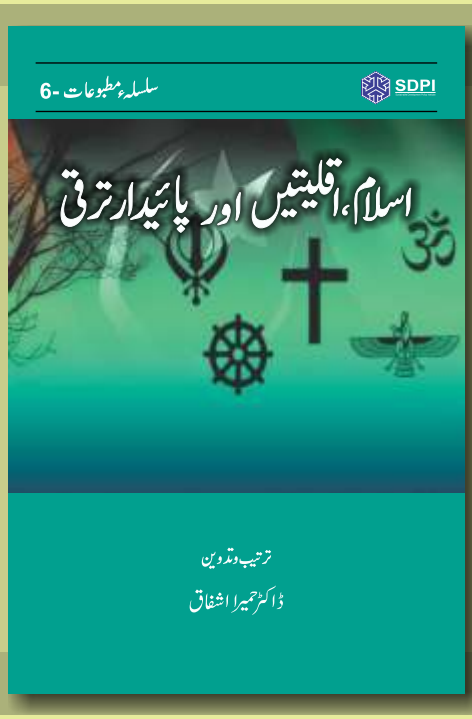


# اسلام، اقلیتیں اور پائیدار ترقی

پاکستان میں اسلام، اقلیتوں اور پائیدار ترقی پر منتخب مضامین کا مجموعہ

زیرِ اشاعت

قیمت -/1200 روپے

خریداری کے لئے اپنے بنک ڈرافٹ

''ایس ڈی پی آئی'' کے نام ارسال کریں۔

ایس ڈی پی آئی، 38۔مین ایمبیسی روڈ، جی 6/3، اسلام آباد، پاکستان۔